عہد رسالت کے بعد مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات کا تاریخی اور سماجی جائزہ

A Social and Historical Review of Muslim & Jews Relationship after the Prophethood

Wajid Ali
PhD Scholar, Department of Islamic Learning, University of Karachi: w.wajidi@yahoo.com

Dr. Muhammad Afzal
Assist. Prof. IPFP, Visiting Lecturer at KIU&Ex.: dr.muhammdafzalkarimi@gmail.com

Abstract:

After the last prophet the period of Hazrat Abu Bakr,Umer,Uthman and Ali is called Khilaphat Rashida. The Khilaphat Rashida which consists of thirty years is the most important section of Islam because the basic principles of Islam were practiced during this period. In this whole period where Muslims had a historic victory, they faced very typical situation between the Muslims also. This period is known as authentic period after the death of prophet. Where most of the principles are applicable for today as well as the rules and regulation adopted to establish relationship with other nations and religions are also as guiding principles for contemporary Muslims. At that period public had a lot of basic rights. Their Individual and political liberties were protected a lot. Both Muslims and Non-Muslims had equal rights and protection of these rights was the obligation of the government. No one was allowed to exploit others or deprive from rights. Non-Muslims had totally religious freedom along with live, property and honour's security and protection. Muslim relationship with Jews were based on the Islamic principles regarding relations with non-Muslims. At that time since Jews were living under the rule of Muslims the calipah treated them better way according to Islamic constitution. According to Islamic law who they were living in Daruslam دارالسلام had been given the status of Zimi ذمی. Therefor the caliphs who came after the prophet Muhammad (PBUH) treated them well in the light of their given instructions regarding Zimi ذمی and gave their all rights.

Keywords: *Prophet, Caliph, Islamic rules, rights, guiding principles.*

عہد رسالت کے بعد حضرت ابو بکر، عمر، عثمان اور علی کے دور خلافت کو "خلافت راشدہ" کہلاتا ہے۔ یہ مجموعی طور پر تیس سالوں پر محیط ہے جس میں حضرت ابو بکر پہلا خلیفہ جبکہ حضرت علی آخری خلیفہ ہیں۔ خلافت

عہدِ رسالت کے بعد مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات کا تاریخی اور سماجی جائزہ

راشدہ تاریخ اسلام میں اس لیے بھی بڑی اہم ہے کہ اس دور میں اسلام کے اصولوں پر بہت زیادہ عمل کیا گیا۔ اس دور میں جہاں مسلمانون کو تاریخی فتوحات میسر آئی وہاں مسلمانون کے آپس کے تعلقات بھی کافی پیچیدہ ہو گئے۔ اس دور کو رسول اللہ کی حیات طیبہ کے بعد معتبر ادوار میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس دور میں جہاں داخلی نظام حکومت کے بہت سے اصول موجودہ دور میں قابل عمل ہیں اسی طرح مختلف اقوام و مذاہب کے ساتھ تعلقات میں قائم رکھے گئے اصول و ضوابط بھی موجودہ دور کے مسلمانوں کے لیے رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس دور میں عوام کو بڑی حد تک بنیادی حقوق حاصل تھے۔ ان کی شخصی و سیاسی آزادی کو بڑی حد تک حفاظت کی جاتی تھی۔ مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے حقوق یکساں تھے اور ان حقوق کا تحفظ حکومت کی ذمہ داری تھی۔ کوئی شخص کسی دوسرے کی حق تلفی نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی کسی پر زیادتی کی اجازت دی جاتی تھی۔ غیر مسلموں کو مذہبی آزادی دینے کے ساتھ ساتھ ان کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت بھی کی جاتی تھی۔ غیر مسلموں سے تعلقات کے بارے میں اسلام کے جو زرین اصول ہیں انہی کے مطابق یہودیوں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات استوار تھے۔

اس زمانے میں چونکہ یہودی مسلمانوں کے ماتحت زندگی گزار رہے تھے اسی بنا پر خلفا راشدین بھی اسلامی قوانین اور دستور کے مطابق ان سے بہتر انداز میں برتاو کیا کرتے تھے۔ اسلامی قوانین کے مطابق دارالسلام میں زندگی گزارنے والوں کو ذمی کا درجہ دیا گیا ہے۔ لہٰذا حضرت محمدؐ کے بعد آنے والے حکمرانوں نے بڑی حد تک ذمیوں کے متعلق ان کے ارشادات کی روشنی میں ان کے ساتھ برتاؤ کیا اور انہیں تمام ذمی حقوق سے بہرہ مند رکھا۔

دورِ خلافت راشدہ میں یہودیوں سے تعلقات

حضرت محمد ﷺ نے مسلمانوں کے پیغمبر ﷺ ہونے کے ناطے اہل کتاب اور ذمیوں سے ممکنہ حد تک حسن سلوک کا مظاہرہ کیا تھا اسی بنا پر ان کے بعد آنے والے خلفا نے اسی انداز کو اپنانے کو ترجیح دی اور انہیں اسلامی قوانین کے مطابق حتی الامکان بنیادی انسانی حقوق سے نوازنے کے ساتھ معاشرتی اور مذہبی آزادی سے بھی نوازا۔ اگرچہ خود حضرت محمدؐ کے یہودیوں کے تین معروف قبیلوں کے ساتھ تعلقات کچھ اچھے نہیں رہے تھے پھر بھی اسلام کے کلی قوانین کی روشنی میں ایسے یہودیوں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات اچھے رہیں جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ قائم معاہدے کو چھیڑا نہیں۔

اس کے علاوہ یہودیوں کے دوسرے قبائل، جن کو میثاق مدینہ کا حصہ قرارادیا گیا تھا، کے ساتھ بھی اچھے تعلقات رہیں تھے یہی وجہ ہے کہ خود مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن میں بھی مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ جن

لوگوں نے تمہارے ساتھ جنگیں نہیں لڑی ہیں اور تمہیں گھروں سے نہیں نکالا ہے ان کے ساتھ انصاف سے پیش آؤ۔[1] لہذا ان قوانین کی روشنی میں مسلمان خلفاءحالت امن کے علاوہ کسی ممکنہ جنگی صورتحال میں بھی اہل ذمہ اور بے گناہ غیر مسلموں کے حقوق کا خیال رکھتے تھے اور جب بھی کسی فوجی لشکر کو کسی غیر مسلم اکثریتی علاقے میں بھیجتے تھے تو کمانڈروں کو خصوصی تاکید کیا کرتے تھے کہ ذمیوں کے ساتھ نیک رفتاری سے پیش آؤ۔[2] اس قسم کی مثالیں تقریباتمام خلفاراشدین کے دور میں ملتی ہیں جیسا کہ حضرت علی نے اپنے کمانڈر مالک اشتر کو جب مصر کا گورنر بنا کر بھیجا تو رعایا سے مہربانی سے پیش آنے کی خصوصی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ رعایا آپ کے دینی بھائی ہیں یا خلقت میں تمہارے ہم نوع ہیں ان سے اچھابرتاؤ کیا کرو۔[3]

خلفا کی اس روش سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دور میں مسلمانوں کی طرح دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کو اجتماعی معاملات میں خصوصی توجہ حاصل تھی جن میں یہودی بھی شامل تھے۔اس کے علاوہ تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ خلفا راشدین نے بقائے باہمی اور معاشرتی استحکام کی خاطر مسلمانوں کی طرح یہودیوں کو تمام حقوق سے بہرہ مند رکھا اور انہیں ممکنہ حد تک معاشرتی تفریق اور امتیاز کا احساس تک نہیں دلایا۔جیسا کہ کہا جاتا ہے حضرت علی کے دور حکومت میں دو خواتین جن میں سے ایک مسلمان جبکہ دوسری یہودی تھی حضرت علیؑ کے پاس بیت المال میں سے اپنا حصہ لینے کے لئے آئیں حضرت علیؑ نے دونوں کو پچیس ہزار درہم کے ساتھ کچھ غذا عنایت کی مسلمان عرب عورت اس بات سے نالاں ہوئی کہ خلیفہ نے ہم دونوں کو برابر کا حصہ دیا(یعنی مسلمان ہونے کے ناطے میرا حصہ زیادہ ہونا چاہئے تھا) یہ سوچتی ہوئی خلیفہ کے سامنے اعتراض کیا۔ خلیفہ نے انہیں جواب دیا کہ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ اس معاملے میں اسماعیل کی نسل کو اسحاق کی نسل پر کوئی برتری نہیں۔[4]

ان جیسے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ عام اور عادی حالات میں مسلمان اور یہودی ایک ساتھ رہتے تھے اور حکومت کے نزدیک بھی جزئی معاملات میں دونوں اقوام کے درمیان خاص کوئی تفریق نہیں تھی یہ باتیں دونوں ادیان کے درمیان معاشرتی اعتبار سے اچھے تعلقات کی نشاندہی بھی کررہی ہیں۔اس کے علاوہ تاریخ میں یہ باتیں بھی

---

[1] عطیة القوصی، الیهود فی ظل الحضار الاسلامیة، قاہره ،مرکز دراسات الشرقیه جامعة الازهر،۲۰۰۱ ،ص۱۱

[2] حسین الاسدی،، النظم الاسلامیه، قم،موسسة دارالهدی للدراسات الاستراتیجیة ،۲۰۱۷،ص۳۵۵

[3] سید رضی،نهج البلاغه، مکتوب ۵۳

[4] الحر العاملی،محمد بن الحسن ،وسائل الشیعه الی تحصیل مسائل الشرعیه، ج۱۱ ، بیروت،احیا التراث العربی،س ن، ص۸۱

تحریر ہوئی ہیں کہ خلافت راشدہ میں مسلمانوں کی طرح اہل کتاب کی جان مال اور عزت کو محترم قرار دیا جاتا تھا کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دی جاتی تھی کی انہیں کوئی اذیت و آزار پہنچائے۔

جس وقت حضرت علی نے یہ سنا کہ حضرت امیر معاویہ کے لشکر نے انبار پر حملہ کر کے ذمی عورتوں سے زیورات چھین لئے ہیں تو آپ نے انتہائی غم و غصہ کے عالم میں کہا کہ: اگر کوئی مسلمان اس قسم کی مصیبتوں کو برداشت نہیں کر سکنے کی وجہ سے مر جائے تو اس کے لئے کوئی ملامت نہیں۔[5] جس وقت حضرت علی کی حکومت قائم ہوئی اور مختلف عہدوں میں ردوبدل کیا گیا تو امیر شام کے ساتھ مرکزی حکومت کے اختلاف کا آغاز ہوا اس وقت مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے تھے بعض خلیفہ چہارم کی حمایت کر رہے تھے جبکہ کچھ امیر شام کی حمایت کر رہے تھے اسی دوران بین النہرین کے یہودیوں نے خلیفہ وقت کی حمایت کا اعلان کیا، کہا جاتا ہے کہ یہودیوں نے جندی شاپور پر قبضے کے بعد مر اسحاق کی سربراہی میں حضرت علی کے پاس گئے اور انہیں اپنی مکمل حمایت کا یقین دلاتے ہوئے وفاداری کا حلف اٹھایا خلیفہ اس بات سے بہت خوش ہوئے اور مر اسحاق (جو کہ جامعہ سورا کا سربراہ تھا) کو ایک اعزاز سے نوازتے ہوئے انہیں گاؤن (عالیجناب) کا لقب دیا۔[6]

ان نکات سے یہ بات سامنے آتی ہے کی حضرت علی کے اپنے دور حکومت میں یہودیوں کے ساتھ اچھے تعلقات تھے اس قسم کے حساس معاملات میں یہودیوں کی طرف سے مرکزی حکومت کی حمایت در حقیقت مسلمانوں کی مرکزیت پر مکمل اعتماد کا مظہر ہے اور ان کے اس عمل سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس دوران اہم معاملات میں وہ اسلامی حکومت کی پشت پناہی کر رہے تھے یہی وجہ تھی کہ خلیفہ نے بھی ان کی تعریف و تمجید کرتے ہوئے وفد کے سربراہ کو گاؤں (عالیجناب) کا لقب دیا۔ اسی دوستانہ ماحول کو دیکھتے ہوئے جن یہودیوں کو ۶۴۱ عیسوی میں جزیرہ عرب سے نکالا گیا تھا وہ دوبارہ جزیرۃ العرب آگئے۔[7]

مسلمان محققین اور مصنفین کے درمیان یہ واقعہ مشہور ہے کہ حضرت عمر کے دور حکومت میں ایک یہودی نے حضرت علی کے بارے میں خلیفہ کے پاس شکایت کی خلیفہ نے حضرت علی کو عدالت میں طلب کیا جب وہ عدالت میں آئے تو خلیفہ نے کہا کہ اے ابوالحسن اس شخص کے ساتھ بیٹھو جس نے آپ کے خلاف شکایت کی

---

[5] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۷

[6] پیرنیا حسن، تاریخ یہود، قم، موسسہ فردا ۱۳۸۷، ص ۱۹۰

[7] جبیب لوی، تاریخ یہود ایران، ج ۲، تہران، کتابفروشی یہود ابروخیم، ص ۳۲۵

ہے حضرت علی انتہائی غصہ اور تکلیف دہ حالت میں یہودی شخص کے ساتھ بیٹھ گئے۔ عدالتی کاروائی ختم ہونے کے بعد خلیفہ نے علی سے پوچھا کہ کیا اس عمل سے آپ ناراض ہوگئے؟ علی نے جواب دیا کہ ہرگز ایسا نہیں میں اس وجہ سے ناراض ہوا تھا کہ آپ نے ہم دونوں کے ساتھ برابر کا سلوک نہیں کیا مجھے احترام کے ساتھ ابوالحسن کہہ کر کنیہ کے ذریعہ بلایا جبکہ اس یہودی کو آپ نے اس کے نام سے پکارا۔[8]

اس واقعہ سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اس زمانے میں یہودی آزادانہ طور پر اپنی رائے کا اظہار کر سکتے تھے اور اس کے علاوہ یہودیوں کو اعتراض کرنے کا آزادانہ حق بھی حاصل تھا اسی بنا پر اس نے خلیفہ کی عدالت میں کبار صحابہ میں سے حضرت علی کے خلاف اعتراض دائر کیا اسی بات کو آج کی اصطلاح میں بیان کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ انہیں معاشرتی، مذہبی اور شخصی آزادی حاصل تھی۔

اسی طرح اس واقعہ سے یہ نکتہ بھی سامنے آتا ہے کہ کبار صحابہ بھی اپنی تمام تر عزت و شرف کے باوجود اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ اجتماعی اور شخصی معاملات میں کسی یہودی کی معمولی سی بھی تحقیر ہو۔ خلفا راشدین میں سے حضرت عمر کے دور میں مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات نسبتا اچھے نہیں تھے حضرت ابو بکر کی وفات کے بعد حضرت عمر کے دور خلافت میں اسلام بڑی سرعت کے ساتھ جزیرۃ العرب سے باہر پھیلتا گیا انتہائی کم مدت میں مسلمانوں نے مغربی ایشیا اور شمال افریقہ کو قبضے میں لانے میں کامیاب ہوگئے۔

اس دور کے یہودیوں کے حوالے سے مورخین نے جو کچھ بتایا ہے اس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے یہودی جزیرۃ العرب سے نکالے گئے تھے بعض نے یہ بھی کہا کہ یہودیوں کا ایک گروہ جس نے پیغمبرؐ کے ساتھ صلح کیا تھا کو حضرت عمر کے دور حکومت میں خیبر سے نکالا گیا چونکہ خلیفہ دوم نے پیغمبرؐ سے سنا تھا کہ جزیرۃ العرب میں دو ادیان ایک ساتھ ممکن نہیں۔[9] جب کہ محدثین میں سے مشہور اور نامور محدثین نے بھی اپنی کتابوں میں نجران، فدک اور خیبر کے یہودیوں کو جزیرۃ العرب سے حضرت عمر کے دور میں نکالے جانے کی طرف اشارہ کیا ہے۔[10]

یہودیوں کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کی حضرت عمر کی پالیسی اس بنا پر نہین تھی کہ وہ یہودیوں سے نفرت کرتے تھے بلکہ وہ اس علاقے میں رہنے والے یہودیوں سے خطرہ محسوس کرتے تھے اسی بنا پر متوقع خطرات سے بچنے

[8] طبارہ، عفیف عبد الفتاح، روح الدین الاسلامی، قاہرہ، دار العلم للملایین، ۲۰۰۳، ص۲۷۷

[9] مسعودی، ابوالحسن علی ابن الحسین، التنبیہ والاشراف، بیروت، مکتبۃ المثنی، ۱۴۳۵، ص۲۲۲

[10] امام مالک، مالک ابن انس، بیروت، دار الغرب الاسلامی الموطا، ج۲، ص۸۳۹

کی خاطر ان کو فدک اور خیبر جیسے علاقوں سے نکال دیا۔ اس حوالے سے بعض معاصر محققین کا کہنا ہے کہ حضرت عمر نے یہودیوں کے اس گروہ کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا جو مسلمانوں کے بارے میں دل میں کینہ رکھتے تھے جبکہ اس وقت نصارا بھی رہتے تھے مگر حضرت عمر نے ان کو جزیرۃ العرب سے تبعید نہیں کیا۔[11]

اس کے علاوہ یہودیوں سمیت اہل کتاب کے حوالے سے حضرت عمر کی اجتماعی پالیسی کے بارے میں معاصر محققین کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے دور حکومت میں اہل کتاب کو بعض سخت شرائط کا پابند کیا جس کے بارے میں اعتراض کیا جاتا کہ ان میں سے بعض شرائط ایسی تھی جن سے بظاہر نسلی اور امتیازی سلوک کا پہلو سامنے آتا ہے جیسا کہ حضرت عمر نے انہیں قرآن اور صاحب قرآن کی توہین نہ کرنے کا پابند بنایا اسی طرح انہیں پابند کیا کہ مسلمان عورتوں کا احترام کیا جائے گا، اس کے علاوہ اہل ذمہ کو خاص لباس پہنے کا پابند کیا تاکہ مسلمانوں اور ان میں پہچان ہو جائیں، اسی طرح انہوں نے اہل کتاب کو مسلمانوں کی موجودگی میں اپنی مقدس کتاب کو اونچی آواز میں پڑھنے سے روکا بھی تھا۔[12] اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ ان کڑی شرائط کی موجودگی میں اہل کتاب میں سے بعض نے جزیہ نہ دینے کی خاطر مذہب کو چھوڑنے کو ترجیح دی۔[13]

جزیرۃ العرب کے یہودیوں کے مقابلے میں ایرانی یہودیوں کے حوالے سے حضرت عمر کی پالیسی کسی حد تک نرم تھی جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر نے بین النہرین میں ایرانی یہودیوں کے پیشوا سے مہربانی کے ساتھ پیش آتے ہوئے انہیں کافی حد تک اندرونی طور پر آزادی دی ہوئی تھی۔[14] حضرت عمر کی یہودیوں کے حوالے سے سخت پالیسوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ کے دور میں یہودیوں کے طاقتور قبیلوں کی خیانت کو دیکھتے ہوئے مزید ایسے واقعات پیش آنے سے روکنے کے لیے جزیرۃ العرب کے یہودیوں کے ساتھ گذشتہ اور اپنے مابعد خلفاء راشدین کی نسبت زیادہ سختی سے پیش آئے۔ ان واقعات سے ہٹ کر ایسے واقعات بھی تاریخ میں موجود ہیں کہ جن سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ دوم بعض موارد میں یہودیوں کے ساتھ انتہائی نرمی اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ وہ کسی قبیلے کے محلے سے گزر رہے تھے ایک نابینا بوڑھے مرد کو ناموافق حالت میں

---

[11] جواد علی، المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، بغداد، نشر جامعہ بغداد، ۱۴۱۳، ج۶، ص ۲۲۰۔۲۲۱

[12] نصر، سید حسین، علم و تمدن در اسلام، مترجم: احمد آرام، تہران، انتشارات علمی و فرہنگی، ۱۹۶۸، ص ۶۳

[13] احمد امین، فجر الاسلام، مترجم، عباس خلیلی، انتشارات اقبال، ص ۸۶

[14] لوی، حبیب، اریخ یہود ایران، ایضا، ج ۲، ص ۳۲۳

دیکھ کر ان سے پوچھا: کیا تم اہل کتاب ہو؟ اس نے ہاں میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں ایک یہودی ہوں۔ خلیفہ نے پوچھا کہ تمہاری حالت ایسی کیوں؟ اس نے جواب دیا کہ جزیہ کی ادائیگی، فقیری اور ضعیف العمری نے میرا ایسا حال بنا دیا ہے، حضرت عمر نے اپنے پاس جو کچھ تھا انہیں دے دیا اور انہیں بیت المال کے خاذن کے پاس لے گئے اور کہا کہ خدا کی قسم ہم نے اس کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا جب جوان تھے تو ان سے کام لیا جب بوڑھاپے کی منزل پہ پہنچ گئے تو ہم نے انہیں تنہا چھوڑ دیا۔[15]

اس کے علاوہ تاریخ میں یہ واقعہ بھی حضرت عمر کے حوالے سے نقل ہوا ہے کہ جب بیت المقدس تیرہ ہجری میں مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوا تو اس شہر کے اسقف اعظم سفرونیوش نے خلیفہ دوم سے تقاضا کیا کہ یہودیوں کو بیت المقدس میں داخل ہونے سے روکیں۔ ان کے اس مطالبے کے برعکس جب اس شہر کا زمام اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں میں آیا تو یہودیوں کو مکمل آزادی دی گئی اور وہ آزادی اور سکون کے ساتھ اس شہر میں زندگی گزارنے لگے۔[16]

بیت المقدس کی طرف خلیفہ کے اسی سفر میں یہ واقعہ بھی نقل کیا جاتا ہے کہ رومیوں نے ہیکل سلیمانی کو تباہ کرتے وقت اس کے بعض حصوں کو مٹی میں دفن کر چکے تھے ہیکل سلمانی کی باز سازی کے دوران جب وہ حصے دریافت ہوئے تو خلیفہ نے انہیں خاک آلود حالت میں دیکھ کر خود ہی اپنے زیب تن لباس سے مٹی جھاڑنے لگے جب مسلمان لشکر نے خلیفہ کو ایسا کرتے ہوے دیکھا تو خلیفہ کی مدد کرتے ہوئے سب ملکر ہیکل سے مٹی کو مکمل طور پر صاف کر لیا۔[17]

اسی طرح خیبر، جو کہ رسول اللہ کے دور سے ہی یہودیوں کا مرکز رہا تھا، کے یہودیوں کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ عہد فاروقی میں مسلمان مجاہدین کے شام کی طرف سفر کے دوران خیبر بھی ایک پڑاؤ تھا۔یہودی ان حالات میں مسلمان مجاہدین پر پانی بند کر دیتے اور ان کے خیمے جلا دیتے تھے جس کی وجہ سے بالآخر حضرت عمر نے ان

---

[15] الاسدی، حسین، النظم الاسلامیہ، ایضاص ۳۶۵

[16] سعفان، کامل، لیہود تاریخاً وعقیدہ، قاہرہ، دارالاعتصام، ۱۹۸۸، ص ۳۷

[17] طبارہ، عفیف عبد الفتاح، روح الدین الاسلامی، ایضا، ص ۲۷۶، ۲۷۷

کو خیبر سے نکال دیا اور شام کا راستہ محفوظ ہو گیا۔[18] خود یہودی مصنفین کی اس بات کو بھی نقل کیا جاتا ہے کہ جب مسلمانوں کے ہاتھوں عراق فتح ہوا تو خلیفہ دوم نے حاخام اکبر کو اسلامی ممالک میں یہودیوں کا مذہبی پیشوا مقرر کیا اور انہیں رأس الجالوت کے لقب سے نوازا۔[19]

اگر ہم اہل کتاب کے لیے ذمی کے عنوان سے حاصل حقوق کو دیکھیں تو اس کی بنیادی وجہ اسلامی قوانین میں اہل ذمہ کے متعلق تاکیدی ارشادات ہیں چونکہ اسلامی قوانین میں ایسا کوئی قانون نہیں تھا جو اہل ذمہ کو اقتصادی طور پر فعال ہونے سے روکے اسی بنا پر انہوں نے کوشش کر کے لین دین کے معاملات میں خوب فائدہ اٹھایا اور ان میں سے بہت سارے سونے کے کاروبار، زراعت اور طب کے شعبوں سے وابستہ رہیں۔[20]

صدر اسلام میں اسلامی حکومتوں کی طرف سے اہل ذمہ سے جزیہ وصول کرنے کے عمل کو بعض مصنفین نے اہل ذمہ کے ساتھ ناانصافی توصیف کرتے ہوئے اس عمل پر اعتراضات کیے ہیں اگر اس معاملے میں تھوڑا سا غور کیا جائے تو یہ مسئلہ مسلمانوں سے زکات کی وصولی کی طرح ہی تھا فرق اتنا ہے کہ زکات کو ایک عبادت کی شکل میں وصول کرتے تھے جبکہ جزیہ اسلامی حکومتوں کی طرف سے زکات کے متبادل کے طور پر ایک قانونی ٹیکس کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا۔ اس حوالے سے معروف ایرانی مصنف ڈاکٹر زرین کوب لکھتے ہیں:

"اگر جزیہ ای از آنھا دریافت می شد، در ازای معافیتی بود کہ از جنگ داشتند و در ازای حمایت و امنیتی کہ اسلام بہ آن ھا عرضہ می کرد، بہ علاوہ این جزیہ سالیانہ از یک تا چھار دینار بیش نبود آن را ھم از کسانی اخذ می کردند کہ توانائی حمل سلاح داشتند، از راھبان، زنان، و نابالغان جزیہ نمی گرفتند، پیران، کوران، عاجزان، فقیران و بزرگان از آن معاف بودند۔"[21]

"اہل ذمہ کو جنگ کرنے سے جو چھوٹ ملی تھی اس کے بدلے میں اور اسلامی حکومت نے جو امن و عامان کو فراہم کیا تھا اس کے بدلے ان سے جزیہ لیا جاتا تھا یہ جزیہ سال میں ایک سے چار دینار تک تھا وہ بھی ان افراد سے لیا

[18] اردستانی، عبد الرحیم سلیمانی، یہودیت، قم، نشر انجمن معارف اسلامی، ۱۳۸۲، ص ۱۴۱

[19] عطیہ القوصی، الیھود فی ظل الحضار الاسلامیہ، ایضا، ص ۴۵

[20] ایضاً، ص ۸۶

[21] زرین کوب، عبد الحسین، کارنامہ اسلام، تہران، موسسہ انتشارات امیر کبیر، ۱۳۷۷، ص ۱۳۶

جاتا تھا جو جنگ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لہٰذا راہبوں سے، عورتوں سے، نابالغ افراد سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا (اس طرح) بوڑھے، نابینا حضرات، فقیروں اور غلاموں کو بھی معافی ملی ہوئی تھی۔"

بنو امیہ کے دور حکومت میں تعلقات

سلطنت بنو امیہ کی شروعات ایک لحاظ سے حضرت عثمان کے دور حکومت سے ہی شروع ہوا تھا۔ اگر چہ تمام مسلمان مورخین کا اجماع ہے کہ حضرت عثمان کا دور حکومت خلافت راشدہ میں شمار ہوتا ہے۔ حضرت عثمان کا تعلق بنو امیہ سے تھا اسی لیے کہا جاسکتا ہے کہ بنو امیہ کے حکمرانی کی شروعات حضرت عثمان سے ہوئی ہے۔ حضرت عثمان کی وفات کا ایک نتیجہ بنو امیہ کی سلطنت کا آغاز بھی تھا اور امیر معاویہ کے دور میں سلطنت بنو امیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ حضرت امیر معاویہ کیجانب سے قائم کی گئی حکومت جہاں بنو امیہ کی سلطنت کا باقاعدہ آغاز ہونے کے ساتھ شخصی حکومت کا تاثر زیادہ غالب تھا۔ بنو امیہ قبائل قریش اور ملک عرب کا ایک نامور قبیلہ تھا۔ اس قبیلے کے اکثر لوگ اپنے تدبر میں اپنے ہم عصروں پر فوقیت رکھتے تھے بلکہ عہد جاہلیت سے انہیں یہ خوبیاں میسر تھیں۔ اگر بنو امیہ میں جمہوریت کی روح ختم نہ کی جاتی یا بنو امیہ کے قابل لوگوں میں ہی اقتدار تقسیم ہوتا رہتا تو یقیناً اس دور کی حکومت میں اضافہ ہوتا اور عالم اسلام کو بھی اتنا نقصان نہ پہنچتا۔

بنو امیہ نے خلافت راشدہ کی فتوحات کو وسعت دے کر مشرق و مغرب میں پھیلا دیا۔ مشرق میں چین اور مغرب میں بحر ظلمات تک انہوں نے اپنے زمانے کی متمدن دنیا کو فتح کر کے فخر حاصل کیا۔ براعظم افریقہ کے ریگستانوں اور ہندوستان کے میدانوں تک اسلام بنو امیہ کی خلافت میں ہی پھیلا۔ اس خلافت کے بعد مسلمانوں کو جدید فتوحات کا بہت کم موقع ملا اور سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ بنو امیہ کے بعد اسلامی حکومت ایک مرکز پر قائم نہیں رہی بلکہ الگ الگ متوازی حکومتیں قائم ہونے لگیں۔ اسلام کا ابتدائی زمانہ اور خلافت راشدہ کا دور مسلمانوں کی سادگی کا دور تھا کیونکہ ان کی ضروریات زندگی بھی محدود تھیں لیکن عہد بنو امیہ میں آہستہ آہستہ ضروریات زندگی وسیع ہونے لگیں اور عیش و عشرت بڑھنے لگا۔

بنو امیہ کی حکومت میں خلافت کو موروثیت میں تبدیل کرنے کے بعد جو سب سے بڑی تبدیلی نظر آئی وہ یہی عیش پرستی اور شہنشاہیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخری دور میں اس کا اثر اس قدر بڑھ گیا تھا کہ آخر کار یہی تبدیل ان کے زوال کی وجہ بن گئی۔ سلطنت بنو امیہ کا ایک قابل تحسین پہلو یہ نظر آتا ہے کہ اس دور میں عربوں کی اپنی

ایک الگ حیثیت رہی۔ عرب فاتح قوم تھی، اخلاق، زبان، تمدن اور مراسم ہر چیز پر عرب غالب تھے لیکن بنو امیہ کے بعد ان کی یہ فوقیت جاتی رہی۔[22]

بنی امیہ کی حکمرانی کے ابتدائی سالوں میں جب وہ آہستہ آہستہ طاقت ور ہو رہے تھے، یہودیوں کا طبقہ اپنے مذہبی رہنماؤں (گاؤن) کی اطاعت اور پیروی میں زندگی بسر کر رہے تھے جنہیں تمام یہودیوں کے نزدیک احترام حاصل تھا۔[23] اس دور میں رہنے کے لیے ان کے لیے کوئی خاص جگہ معین نہیں تھی عموماً وہ اس بات کو ترجیح دیتے تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ ہی رہیں۔[24] انہیں اس زمانے میں امن وعامہ کی سہولیات کے ساتھ اپنے مذہبی اور قومی مراسم کی بجا آوری میں مکمل آزادی حاصل تھی حکمران کوئی مداخلت بھی نہیں کرتے تھے۔[25]

اس کے علاوہ معاشرتی طور پر بھی آزادانہ کام کر رہے تھے بنی امیہ کے دور خلافت میں گذشتہ خلفا کی طرح یہودی اقتصادی مراکز اور بازار میں متحرک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس دور کے اکثر تاجر یہودی شمار ہوتے تھے۔[26] تجارت کے علاوہ آہستہ آہستہ انہوں نے دوسرے شعبوں پر بھی توجہ دینا شروع کیا تاکہ معاشرے میں ایک متحرک اور کار آمد قوم کے طور پر سامنے آسکیں۔ عموماً اس دور میں شعراء اور قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی اسی لیے اس آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہودی تحریری شعبے میں بھی اپنی مہارتیں دکھانے میں کامیاب ہو گئے۔ علاوہ ازاین عرب کے لوگ شعر کو مخصوص انداز میں اور اسے خوبصورت اور بلیغ انداز میں پڑھنے کو پسند بھی کرتے تھے اور ترجیح بھی دیتے تھے تو یہودیوں نے اس فضا سے استفادہ کرنے کی خاطر پہلے سے بہتر انداز میں عربی زبان میں مہارت حاصل کرنے کی طرف توجہ دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے بہت جلد یونانی زبان کی مختلف موضوعات پر مشتمل کتابوں کو عربی میں ترجمہ کیا۔

یہودی عموماً دو قسم کے اشعار پڑھنے کو ترجیح دیتے تھے ایک وہ اشعار جو عظمت خدا پر مشتمل ہوں دوسرے وہ اشعار جو ان کی دردناک سرنوشت کی یاد کو تازہ کرتے ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے اشعار کے

---

[22] نجیب آبادی، مولانا اکبر شاہ، تاریخ اسلام، لاہور، مکتبہ خلیل، ج ۲، ۲۰۰۴، ص ۱۸ تا ۲۱

[23] پرویز رہبر، تاریخ یہود، تہران، انتشارات سپہر، ۱۳۴۵، ص ۱۹۲

[24] جعفریان، رسول، تاریخ سیاسی اسلام، قم، دفتر نشر الہادی، ۱۳۷۷ش، ص ۳۲۲

[25] مصاحب، دایرۃ المعارف فارسی، ج ۳، ص ۲۰۲۱

[26] زرین کوب، عبد الحسین، تاریخ ایران بعد از اسلام، ایضا ص ۴۲۳

انداز اور موضوع میں تبدیلی لاتے گئے انہوں نے یہودی معاشرے کی اقتضا کے مطابق آہستہ آہستہ عبادات کو بھی اپنے اشعار کا موضوع بنایا چونکہ یہودی سال کی پہلی عید اور عید کیپور کے دن زیادہ وقت کنیسہ میں گذارنے کو ترجیح دیتے تھے اسی طرح آہستہ آہستہ یہودیوں میں ادبیات کنیسہ نے جنم لیا اور شعرا ان مخصوص دنوں کے لئے اشعار تیار کرتے تھے جنہیں اس زمانے میں پیطانیم کے نام سے جانا جاتا تھا۔[27]

بیان شدہ مطالب سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بنی امیہ کی موروثی حکومت اور اس کی مخالفوں کے خلاف داخلی طور سخت رویئے کے باوجود یہودیوں کے لیے کوئی مشکل یا سختی کا سامنا نہیں ہوا۔ یہودی اگرچہ ایک موروثی اور شاہان حکومت کے زیر نگین اہل ذمہ کے عنوان سے زندگی بسر کر رہے تھے پھر بھی انہیں سماجی اور مذہبی طور پر آزادی دی گئی تھی جس کی وجہ سے انہیں تجارت کے علاوہ تحریری اور شعری شعبے میں بھی اپنی مہارتیں سامنے لانے کا بھرپور موقع میسر آیا۔ ان کی اس آزادی کو دونوں ادیان کے پیروکاروں کے درمیان اچھے تعلقات کی نشاندہی کے عنوان سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اس دور کے حوالے سے یہ امکان بھی پایا جاتا ہے کہ چونکہ بنی امیہ کے اقتدار کے ابتدائی کئی سالوں میں مسلمانوں کے درمیان اختلافات شدت اختیار کر چکے تھے جس کی وجہ سے بنی امیہ کی ساری توجہ اندرونی مسائل پر مرکوز تھی اس دور میں دوسرے ادیان کے پیروکاروں کی نسبت وہ مسلمانوں کا ہی ایک قبیلہ بنی ہاشم کو اپنا حلیف قرار دیتے تھے اسی لیے بنو امیہ کی تمام تر توجہ بنوہاشم سمیت انکے اقتدار کے لیے خطرہ بننے والے داخلی عناصر پر مرکوز تھی اسی لیے یہودیوں سمیت دوسرے ادیان کے پیروکاروں کو کسی دباؤ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

سلطنت بنو عباس، مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات

خلافت راشدہ کے خاتمے کے بعد قائم کردہ موروثی سلطنتوں میں سے ایک سلطنت کو بنو عباس کا دور حکومت کہا جاتا ہے۔ یہ خلافت بنیادی طور پر بنو امیہ کے خلاف جاری ایک تحریک کے نتیجے میں قائم ہوئی تھی۔ عباسیوں کی حکومت بھی امویوں طرح کی ایک موروثی حکومت تھی۔ بغداد میں عباسی خلافت کے قیام کے بعد بہت سے یہودی اس شہر کی طرف ہجرت کرنے لگیں۔ اس کے بعد بتدریج راس الجالوت بھی اس شہر میں سکونت اختیار کرنے لگے۔[28]

---

[27] لوی، حبیب، تاریخ یہود ایران، ایضا، ج ۲، ص ۳۳۴

[28] خطیب بغدادی، احمد بن علی، تاریخ بغداد، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ج ۵، ۱۹۹۹ ص ۴۷۶

بنی امیہ کے دور حکومت کی طرح بنی عباس کے دور حکومت میں بھی یہودی اہل ذمہ کے عنوان سے زندگی بسر کر رہے تھے اجتماعی اور مذہبی لحاظ سے انہیں گزشتہ ادوار کی نسبت زیادہ آزادی حاصل تھی۔ یہودی اپنے تمام مذہبی مراسم آزادی کے ساتھ اپنے کنیسہ میں انجام دے رہے تھے ان مراسم میں بعض دفعہ خود حکمران بھی شامل ہوتے تھے۔ اگر چہ مختلف ادیان کے پیروکار الگ الگ مراسم انجام دیتے تھے اور زندگی کا رہن سہن بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا مگر پھر بھی حکومت کی طرف سے ذمیوں کے تحفظ کے لئے خاص حکم نام جاری کیا گیا تھا تاکہ ان کی جان ومال محفوظ رہیں۔

مذہبی نقطہ نگاہ سے شاید ایک چیز جو اہل ذمہ کے لئے مشکل بن رہی تھی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے ادیان کے پیروکار ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے تھے اور ایک دوسرے کے دین کو قبول اور تبدیل نہیں کر سکتے تھے ان کے لیے صرف ایک ہی آپشن تھا وہ یہ کہ اگر دین کو تبدیل کرنا چاہیں تو صرف اسلام کی طرف آسکتے تھے۔[29] بنی عباس کے دور حکومت میں ہی یہودیوں کی مذہبی کتب توریت اور تلمود کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ اس کے علاوہ اجتماعی لحاظ سے انہیں جو آزادی میسر تھی اسی سے استفادہ کرتے ہوئے بغداد میں یہودیوں نے اپنے لیے ایک محلہ بنالیا جہاں صرف یہودی رہتے تھے کہا جاتا ہے کہ یہ محلہ مغولوں کے بغداد پر حملے تک موجود تھا اور اسی محلہ میں انہوں نے دس مدرسے اور ۲۳ معبد تعمیر کیے جن میں سے مرکزی معبد کو رنگ برنگے پتھروں اور طلا و نقرہ سے سجایا گیا تھا۔[30]

ایک یہودی سیاح بنیامین تطیلی نے ۱۱۶۸ کو المستنجد باللہ کے دور حکومت میں بغداد کا سفر کیا تھا وہ خلیفہ کے دربار میں رأس الجالوت (یہودیوں کے پیشوا) کے مقام و مرتبہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے اس نے اپنے سفر کے بارے میں لکھا ہے کہ حاخام اکبر (رأس الجالوت) جب خلیفہ سے ملاقات کے لئے جاتے تھے تو انتہائی احترام کے ساتھ خلیفہ کے پاس لے جاتے تھے اور انہیں خلیفہ کے پہلو میں جگہ مل جاتی تھی اور خلیفہ ان کے مسائل کو غور سے سننے کے بعد انہیں حل بھی کرتے تھے[31] بہر حال بنی عباس کے دور خلافت کا مجموعی جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی گزشتہ ادوار کی طرح مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات اچھے رہیں۔ خلیفہ عباسی عبد اللہ سفاح کے بعد ہارون

[29] پاینده، ابوالقاسم، تاریخ سیاسی اسلام، تہران، انتشارات جاودانی، ۱۳۶۲، ج ۲، ص ۳۲۱،

[30] سعفان، کامل الیہود، تاریخاً وعقیدۃً، ایضا، ص ۳۸

[31] عطیہ القوصی، الیہود فی ظل الحضارۃ الاسلامیہ، ایضا، ص ۲۸۔۲۹

رشید تک جتنے خلفا آئے ہیں اگر ان کے دور حکومت کا جائزہ لیا جائے تو ایسا کوئی واقعہ نظر نہیں آتا ہے جس کے ذریعہ ہم مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات کے بارے میں مثبت یا منفی رائے کا اظہار کر سکیں۔

اس کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی ناخوشگوار واقعہ یا حادثہ پیش آتا تو ضرور مورخین نقل کرتے۔ ہاں کچھ جزئی واقعات اس دور کے حوالے سے تاریخ کی بعض کتابوں میں ذکر ہوئے ہیں جیسے عباسی خلیفہ ابو العباس عبد اللہ سفاح کے دور حکومت میں ایک یہودی شخص غافلہ ابو عیسیٰ کے قتل ہونے کا واقعہ ذکر کیا جا سکتا ہے۔[32] عباسی خلیفہ منصور کے دور حکومت میں رہنے والے یہودیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے وہ تجارت پیشہ لوگوں میں سے شمار ہوتے تھے اس عمل میں بین النہرین اور ایرانی یہودیوں کا بڑا حصہ تھا اس کے علاوہ یہودی طب اور سرکاری عہدوں پر کام کرتے تھے جیسا کہ کہا جاتا ہے جب خلیفہ منصور نے اپنے بیٹے مہدی کی خلافت کے لئے بیعت لینے کے بارے میں سوچا تو اس نے اپنے خاص یہودی طبیب فرات بن شحنا ثا سے خصوصی طور پر مشورہ لیا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے منصور نے دوسری اقوام کی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کرنے لئے ایک ادارہ بنایا تھا یہودی اس ادارے میں فلسفہ، طب اور یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے میں فعال کردار ادا کر رہے تھے۔[33]

عباسی خلفا میں سے ہارون پہلا خلیفہ تھا جس نے قدیم روش کو زندہ کرتے ہوئے حضرت عمر کی طرح یہودیوں کو مختلف چیزوں کا پابند بنایا اس بنا پر یہودیوں کے نقطہ نظر سے ان کا دور حکومت نسبتا سخت تھا۔ ہارون نے خصوصی حکم دیا تھا کہ اہل ذمہ مسلمانوں سے الگ لباس زیب تن کریں۔ سوار ہونے کا انداز بھی اس طرح ہونا چاہئے جس سے ان کی پہچان میں آسانی پیدا ہو جائے۔[34] ان جزئی واقعات کے باوجود یہودیوں کو اس وقت بھی اجتماعی اور علمی طور پر خاطر خواہ آزادی حاصل تھی اور ان دو شعبوں میں مسلسل اپنے کام جاری رکھے ہوئے تھے۔ اسی آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے احمد بن عبد اللہ بن سلام نامی یہودی شخص نے تورات کو عربی میں ترجمہ کیا تھا۔[35] ہارون الرشید حد الامکان اہم حکومتی مناصب پر یہودیوں کو لگانے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے تھے اس لیے ان کی تعیناتی سے پہلے خلاف قانون کام سے روکنے کے لیے مسلمانوں کی طرح ان سے بھی حلف لیتے تھے۔ کتاب دیوان انشا میں جو کہ

---

[32] لوی، حبیب، تاریخ یہود ایران، ج ۲ ص ۳۴۲

[33] ایضاً، ج ۲، ص ۳۵۴

[34] آملی، محمد بن محمود، نفایس الفنون فی عرایس العیون، تہرانانتشارات اسلامیہ، ۱۳۸۱، ج ۲، ص ۲۳۱

[35] ابن ندیم، الفہرست، تہران، انتشارات ابن سینا، ۱۳۴۳، ص ۲۳

۱۴۳۶ میں تالیف ہوئی تھی یہودیوں کے حلف نامے کے اصل الفاظ تحریر ہیں۔ ہارون کے دور حکومت میں فضل بن ربیع پہلا شخص تھا جس نے اس حلف نامے کو تحریر کیا تھا۔[36] مامون کے دور خلافت میں اسلامی حکومت کی طرف سے اہل ذمہ کو داخلی اور مذہبی طور پر آزادی ملی ہوئی تھی اس کے علاوہ مامون نے ایک یہودی فرقے کو قانونی قرار دیتے ہوئے اس فرقہ کے کچھ بزرگوں کو پیشوا کے طور پر مقرر کر دیا اسی طرح مامون کے دور حکومت میں ہی جب راس الجالوت کا انتقال ہوا تو داودی فرقے کے دو شہزادوں کے درمیان اس منصب پر فائز ہونے کے لئے اختلاف پیدا ہوا سرانجام جب معاملہ مامون کے پاس گیا تو اس نے داود بن یودا کو راس الجالوت مقرر کر دیا۔[37]

مامون کی حکومت کے بعد جب متوکل عباسی کی حکومت آئی تو ایک دم اس نے اہل ذمہ کے حوالے سے گذشتہ حکومتی پالیسی سے انحراف کرتے ہوئے مخصوص لباس پہننے کا پابند بنایا اس طرح ان کی حکومت میں بہت سے یہودی کنیسے حکومتی سختی کی بنا پر ویران پڑ گئے۔[38] مامون کی حکومت کے بعد جب مقتدر اور معتضد عباسی کی حکومت کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے اس زمانے میں یہودی مذہبی طور پر آزادی سے ہمکنار ہونے کے ساتھ اقتصادی طور پر بھی انتہائی متحرک اور مضبوط تھے اسی بنا پر حکومت نے مختلف شعبوں میں انہیں مختلف مناصب سونپنے کے ساتھ انہیں جہبذ کے لقب سے بھی نوازا تھا۔

اس دور کے تجارت پیشہ یہودیوں میں سے دو افراد کے نام مشہور اور معروف ہیں جن کا بہت بڑا سرمایہ بھی بازار میں لگا ہوا تھا ایک کا نام یوسف بن فنحاس جبکہ دوسرے کا نام ہارون بن عمران تھا جنہیں جہبذان کے طور پر جانا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اقتصادی طور پر ان کی طاقت اس قدر مضبوط تھی کہ خود مرکزی حکومت اپنے ملازمین کو تنخوا دینے کے لئے ان سے قرضہ لینے پر مجبور تھی چنانچہ ابن فرات نے اپنی وزارت کے پہلے سال ہی یوسف ابن فنحاس سے قرض کی درخواست کی جو کہ اس وقت اہواز کا جہبذ تھا تاکہ سرکاری ملازمین کو دو مہینے کی تنخواہ ادا ہو جائے۔[39]

ان وقائع اور شواہد کے تناظر میں عباسی خلافت میں مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ بنو امیہ کی طرح بنو عباس کے دور میں بھی یہودی مسلمانوں کی حکومت میں اچھی زندگی

[36] ، آدم متز، تمدن اسلامی در قرن چہارم ہجری، مترجم، علی رضا ذکاوتی، تہران، انتشارات امیر کبیر، ۱۳۶۲، ص ۷۸

[37] ، بررسی موقعیت سیاسی و اجتماعی یہودیان ایران از دور مغول تا پایان دورہ صفویہ، ص ۲۵

[38] الابشیھی، محمد بن احمد، المستطرف فی کل فن مستظرف، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ج ۸، ۱۹۸۶ ص ۲۴۸

[39] الوزراء او تحفۃ الامرا فی تاریخ الوزرا، ص ۴۸، ۴۹

گزار رہے تھے۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ بہت سارے عباسی خلفانے ان کو حکومتی مناصب پر فائز کیا اور بوقت ضرورت ان کی صلاحیتوں سے استفادہ بھی کیا۔ جن خلفاکے دور میں یہودیوں کے حوالے سے سختی کے واقعات جزئی طور پر نقل ہوئے وہ در اصل مذہبی معاملات کی حد تک تھے۔ اگر اس دور میں ان کے اجتماعی، علمی اور تجارتی سر گرمیاں دیکھی جائے تو وہ عادی حالت میں جاری تھیں۔ اگر ہم بنو امیہ اور بنو عباس کے ادوار کا تقابلی جائزہ لیں تو بنو عباس کی حکومت یہودی کے حوالے سے زیادہ فراخ دلی سے کام لے رہی تھی۔